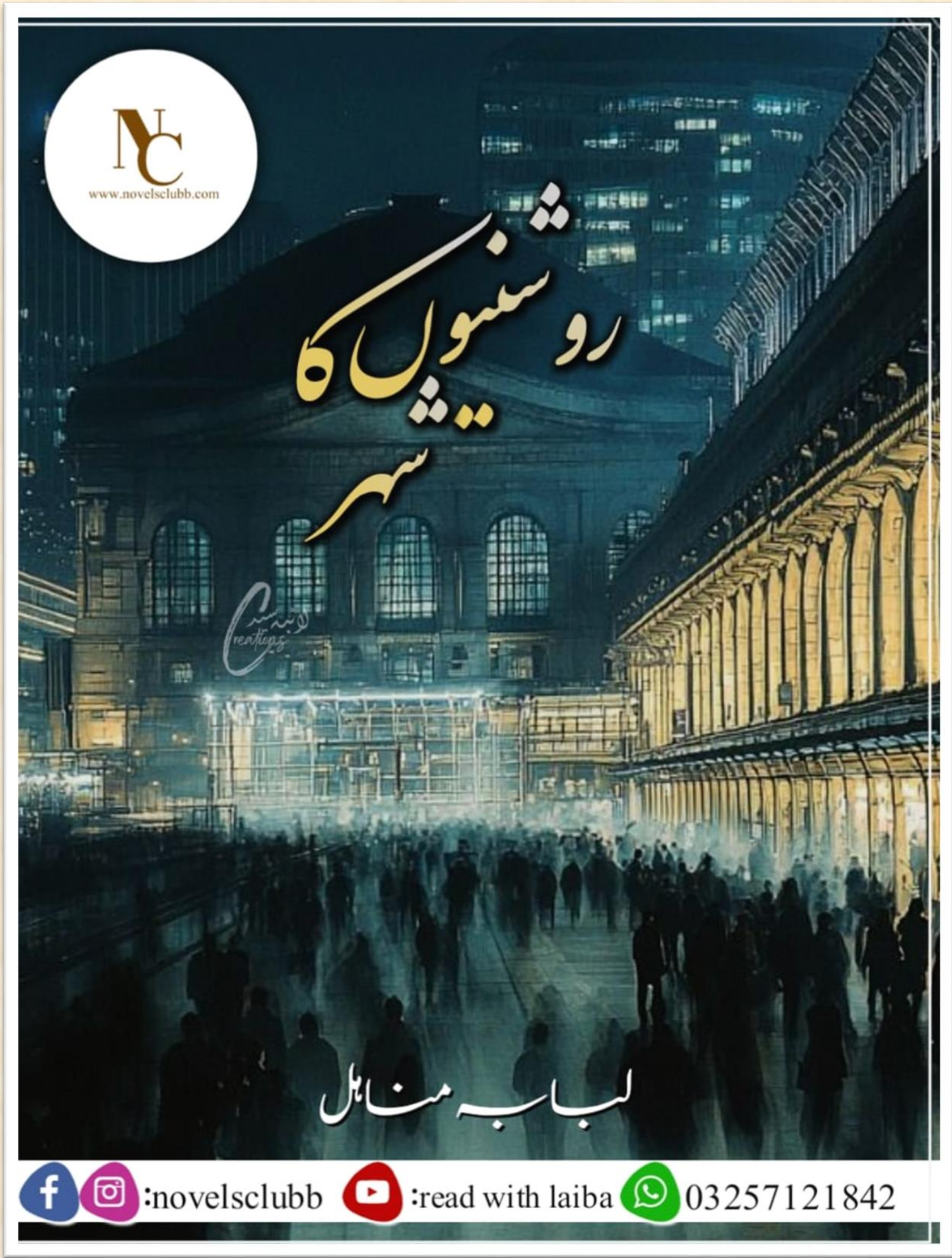

www.novelsclubb.com
روشنیوں کا شہر
لبابہ مناہل
:novelsclubb
:read with laiba
03257121842

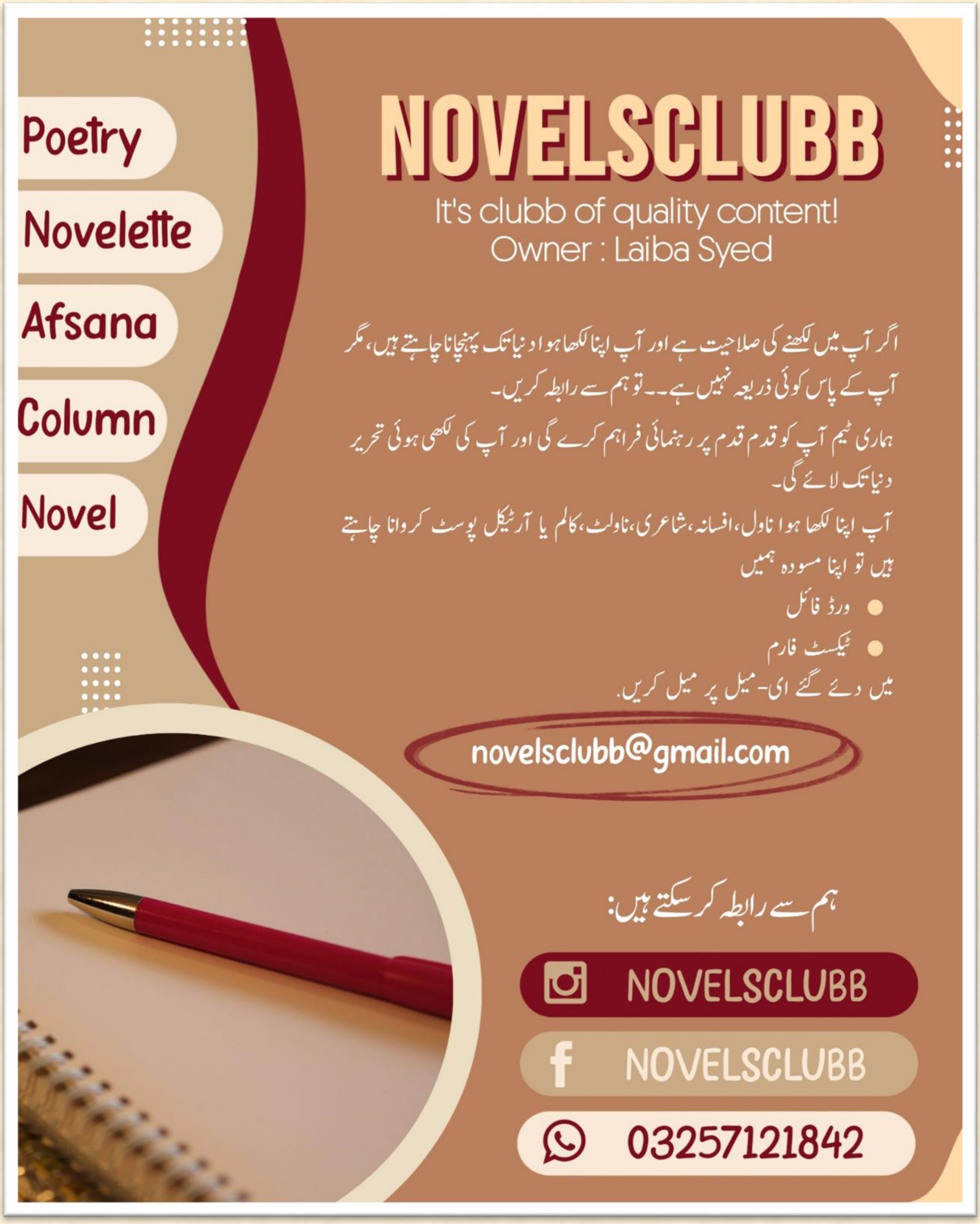

Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

روشنیوں کا شہر

از قلم

لبابہ مناہل

Clubb of Quality Content!

روشنیوں کا شہر

از قلم لبابہ مناہل

دیوار پر لگے ٹیلی وژن پر شہ سرخیاں چل رہی تھیں۔

"کراچی میں ایک مال نے اچانک آگ پکڑ لی۔"

اب ساتھ ہی مال کا نام اور کراچی کا علاقہ بتایا جا رہا تھا۔

ٹیلی وژن کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھا فرد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے زاویوں سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی نا محسوس سی کیفیت اس کے اعصاب پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ وہ شخص گھر میں تنہا تھا۔ اس کے دماغ میں بار بار ایک ہی بازگشت ہو رہی تھی۔

"کراچی میں ایک مال نے اچانک آگ پکڑ لی۔ دس افراد جاں بحق، پچاس زخمی۔"

باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کے پہلے دو بٹن کھولے تھے۔ پانی کو حلق کے نیچے اتارتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"کراچی کا ہر فرد نا کردہ گناہوں کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔"

اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے تھے۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

یہ کراچی کے مشہور علاقے لیاری کی سڑکوں کا منظر تھا۔ دھکم پیل یہاں دولہے کا سہرا تھا۔ منشیات کی خرید وفروخت یہاں کی شان سمجھی جاتی تھی اور غنڈہ گردی، یہ کہنا درست ہوگا کہ غنڈہ گردی کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔ڈکیتی کے لیے تو پورا کراچی ہی مشہور تھا۔

بدبودار گلیوں سے ہوتے ہوئے یہ منظر ایک خستہ حال گھر کے اندر کا تھا۔ سورج کی پہلی پہلی کرن تھی اور اس گھر میں شور اپنے عروج پر تھا۔

"امی، میری جرابیں اس ٹکلے نے چڑھالی ہیں۔"

وہ بچہ جس کے سر پر بال عام بچوں کے مقابلے میں کم تھے، سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولا تھا

۔

"امی، اس جنگل کے سر والے کو کہہ دیں، مجھے اس کی بدبودار جرابیں پہننے کا کوئی شوق نہیں ہے

۔"

پہلے بچے کے سر پر بال نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ دوسرے بچے کے بال اس قدر لمبے تھے کہ انہیں کپڑے کی لیر میں قید کرنا انتہائی آسان تھا۔

ثمینہ بیگم باورچی خانے سے نکلتے ہوئے دونوں کو کان کے نیچے ایک ایک لگا چکی تھیں۔

"کوئی ایک صبح تم جاہلوں نے ایسی کی ہو کہ جس میں میرے کلیجے کو سکون ہو تو میں مر نہ جاؤں"۔

باورچی خانے سے نکل کر وہ اس خستہ حال گھر کے دوسرے کمرے میں چلی گئیں تھیں۔اس گھر میں دو کمرے تھے۔ایک کمرے میں اوپر نیچے پانچ بستر لگے ہوئے تھے۔ایک بستر پر بوا سو رہی تھیں، بوا کے ساتھ لگے بستر پر نوری تھی اور تیسرے بستر پر اجمل بھائی، جو کہ کی پہلی اولاد تھا، سو رہا تھا۔وہ رات کو دکان سے دیر سے آیا کرتا تھا، اسی لیے صبح دیر سے اٹھتا تھا۔

دوسرے کمرے میں دو بستر تھے۔وہ کمرہ عظمت صاحب اور ثمینہ بیگم کے استعمال میں تھا۔

"اجمل کے ابو، اٹھ بھی چکو۔"

ثمینہ بیگم عظمت صاحب کے سر پر چیختی ہوئی کہہ رہی تھیں۔بستر کی دوسری طرف رکھی ٹوکری میں سے انہوں نے جرابوں کا جوڑا نکالا تھا۔عظمت صاحب کو ایک دفعہ پھر جگاتے وہ کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

"یہ پکڑ، امجد۔"

Clubb of Quality Content!

ثمینہ نے جراب امجد کی طرف اچھالی تھی۔ جراب کو اپنی مُٹھی میں قید کرتے وہ پہننے بیٹھا تھا ۔اسی لمحے کمرے کے دروازے سے عظمت صاحب برآمد ہوئے تھے۔

"ثمینہ جلدی کر۔"

ثمینہ بیگم نے کچن میں ہی آہ بھری تھی۔

"آئے ہائے، پہلے خود دیر سے اٹھا کر پھر میرے سر پر شور ڈال دیا کر۔"

چائے اور پاپے لیے وہ باہر آکر بیٹھی تھیں۔

امجد نے آخری بار اپنے بالوں کو درست کیا تھا۔ پیچھے کھڑے احمد نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے ابا کو مخاطب کیا تھا۔

"ابا، اس عورت کو کہیے بال کٹوا لے۔"

ابا نے ایک نظر احمد کو دیکھا تھا، جس کا سر پچھلے دنوں وہ خود منڈوا کر لائے تھے۔

امجد نے تڑپ کر احمد کو دیکھا تھا۔

"کمینے انسان، تیرا سر کبڈی کا میدان بنا ہوا ہے تو تو میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

Clubb of Quality Content

"تیرا سر جو جوؤں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے وہ نظر نہیں آ رہا؟"

ابھی جنگ عظیم شروع ہونے ہی والی تھی کہ ابا میدان میں کود پڑے تھے۔

"شام کو امجد تجھے میں بال کٹوانے لے جاؤں گا۔"

احمد نے کمینگی سے بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تھی۔ ابا لے کر جا رہے تھے یعنی کبڈی کا میدان تیار تھا۔ ایسا میدان جس پر کبڈی جوؤں کے انڈے بھی نہیں کھیل سکتے تھے۔

"احمد بچے، یہ تیرا میرا ادھار ہے۔"

امجد نے انگلی اٹھا کر احمد کو دھمکایا تھا۔

ناشتے کے بعد گھر کے تین افراد اکٹھے نکلے تھے۔ امجد اور احمد لڑتے ہوئے اسکول کے راستے پر تھے اور احمد کے ابا؟

وہ اپنی ٹک ٹکی کو چلنے کی کوشش میں مگن تھے۔

"امجد کے ابا، میں تو کہتی ہوں کہ اس کھسیانی کو اب بیچ ہی دو۔"

"تیرا ابا مجھے پھر نوکری پر چھوڑنے جائے گا؟"

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"آئے ہائے، میرا ابا کیوں آئے گا؟ تجھے تو اس سے قبر میں بھی پیسے چاہییں۔ زندہ تھا تب بھی تو مانگتا تھا، اب مر گیا ہے تب بھی اسے سکون نہیں کرنے دے رہا۔"

ثمینہ بیگم ہاتھ ہلاتی، منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی واپس گھر کے اندر جا رہی تھی۔

"پہلے بھی یہ کلموئی موڑ سائیکل میرے ابا نے لے کر دی اور اب نئ بھی قبر سے لے کر دے۔"

"ہائے رے بہو، تیرے ابا نے ایک خراب سی بائیک لے دی اور تو دس مرتبہ میرے بیٹے پر جتاتی ہے۔"

یہ تھیں ذلیخہ بوا، محلے اور گھر دونوں میں لگائی بجھائی کا کام کرنے والی۔ نہ ان کی زبان سے نکلتے جھوٹ میں لڑکھڑاہٹ تھی، نہ کونے کھدرے کی آواز سننے میں رکاوٹ تھی، بس ایک ٹانگ ہی لڑکھڑاتی تھی جس کی بدولت سب کا جینا محال تھا۔

"بس بوا کان ہی لگائی رکھو۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

لیاری ایک ہی ہے مگر اس کے رخ بے شمار ہیں۔ لیاری کا ایک رخ رحمان ڈکیت ہے اور دوسرا رخ صلاحیتوں کا سمندر۔

ایک ہی علاقے کی مختلف گلیوں میں مختلف کھیلوں کا راج ہے۔ان تنگ گلیوں میں رہائش پذیر بچے بہترین فٹبالرز ہیں۔انہی تنگ گلیوں میں رہنے والے بچے گلوکار ہیں۔خود لکھتے ہیں، خود گاتے ہیں۔انہی گلیوں میں بہترین باکسرز ہیں۔شطرنج جیسے پیچیدہ کھیل بھی ان گلیوں کی شان ہیں۔

اس وقت گلی میں لڑکے نہ ہونے کے برابر تھے۔چند خواتین سردیوں کی دھوپ میں چھتوں پر بیٹھی تھیں۔اپنے اپنے گھروں سے ہی حلق پھاڑ کر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ایک لقمہ ذلیخہ بوا دیتی تھیں،ایک لقمہ ان کے بغل میں رہنے والی نبیلہ باجی دیتی تھیں اور ایک لقمہ پچھواڑے میں رہنے والی ساجدہ خالہ دیتی تھیں۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

اگر گھر کا کوئی کام ذلیخہ بوا کو دے دیا جاتا تو وہ کہتیں:

"ہائے خدا، میری لنگڑی ٹانگ، گھٹتی عمر کا تو خیال کر۔بوڑھی لنگڑاتی ماں سے کام کروائے گی۔"

وہی بوڑھی لنگڑاتی ماں سردیوں کی دھوپ میں سب سے پہلے سڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتی تھیں اور اگر ان کی سیڑھیاں چڑھنے پر تنقید کی جاتی تو کہتیں:

"ہائے، ہائے، ہائے میری تو دونوں ٹانگیں قبر میں ہیں۔ قبر میں دفنانے سے پہلے ہی تو مجھے کمرے میں قید کرتی ہے۔"

وہی بوڑھی لنگڑاتی بوا جن کی دونوں ٹانگیں قبر میں تھیں، چھتوں پر کلیجہ پھاڑ کر چغلیاں کرنے سے بلکل نہ گھبراتیں تھیں۔

"ساجدہ، تو نے نہیں سنا؟ اسلم کا اور کومل کا کچھ چکر وکر چل رہا ہے۔"

ذلیخہ بوا کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ ساجدہ خالہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا تھا پھر نظریں پھیلائی تھیں۔

"میں نہ کہتی تھی ذلیخہ بوا مجھے دال کچھ کالی لگتی ہے۔"

ذلیخہ بوا نے چہرے کے نقش بگاڑے تھے۔

"بڑی ہی بے شرم جوان نسل ہے۔ نہ ماں کا خیال، نہ باپ کا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ذلیخہ۔ اللہ غارت کرے۔"

اب نبیلہ باجی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بددعا دی تھی۔

"توبہ کرو، نبیلہ باجی۔ پرائی بیٹی کو بددعائیں دے رہی ہو، تیری بیٹی پر نہ آن پڑے۔"

سیڑھیوں سے اوپر آتی ثمینہ بیگم نے نبیلہ باجی کو ٹوکا تھا۔

"کیسی منحوس باتیں کرتی ہو بہو۔ ہم نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا۔"

"بس کسی کے کردار پر بات کی ہے۔"

بوا نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا جبکہ ساجدہ خالہ بولی تھیں۔

"کتنی لمبا زبان ہے تیری، ثمینہ۔ تجھے کیڑے پڑیں۔"

ثمینہ نے ایک نظر ساجدہ خالہ کو دیکھا تھا۔ یہ کوئی نیا منظر نہیں تھا۔ ان تین خواتین کا پورے محلے کو پتہ تھا۔ عمر کے آخری حصے میں ہونے کے باوجود محلے کے ہر گھر میں لڑائی انہی تینوں کی بدولت ہوتی تھی۔ صبح سے شام تک یہ بیٹھ کر ایسے ہی جملے کستی تھیں اور پھر وہ جملے کبوتر کی طرح ہر گھر میں موضوع گفتگو بنتے تھے اور پھر ایک گھر زلزلے کی زد میں آتا تھا۔

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ثمینہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ آج کس کا گھر آگ کی زد میں آئے گا۔ کومل کا، اسلم کا، یا اسلم کی منگیتر کا۔۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

کراچی کی مصروف شاہراہ پر ایک گاڑی تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔اندر بیٹھا فرد اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ صبح کی خبر اب تک اس کے کان میں گونج رہی تھی۔

ہر سال ایک دفعہ کراچی میں ایسا واقعہ لازمی ہوتا تھا۔ ہر سال کراچی کے دس سے زائد بچے گٹروں میں ضرور گرتے تھے۔ہر سال کراچی کے لوگ لازمی مرتے تھے۔

اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔اس کی آنکھیں غم کی آماجگاہ لگتی تھیں۔

ایک نیوز چینل کے آفس کے باہر گاڑی رکی تھی۔سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص اترا تھا۔گاڑی کی چابی چوکیدار کی جانب اچھال کر وہ لفٹ میں داخل ہو گیا تھا۔اس کے آنے پر چند لوگوں نے اسے سلام کیا تھا۔اس کے ساتھ کام کرنے والے افراد اس کے پاس آئے تھے۔

اس کی نشریات کا وقت شام نو بجے تھا۔وہ جا کر کیمروں کے سامنے بیٹھا تھا۔اس کی پشت پر سبز پردہ لگا ہوا تھا۔سبز پردے پر پس منظر بدلنے کے مراحل آسان تھے۔شو کے آغاز کی گنتی شروع ہو گئی تھی۔صفر پر شو کا آغاز ہو چکا۔

"السلام علیکم ناظرین!

آپ دیکھ رہے ہیں 'پاکستان کے مسائل'۔"

وہ مشہور صحافی تھا۔ صحافت کرنا بھی جانتا تھا اور اپنے لفظوں کے لیے لڑنے میں بھی ماہر تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

"امجد، تو نے اگر اب گول نہ روکا تو ہم تجھے نہیں کھلائیں گے۔"

پچھلے دو گولز اوپر نیچے امجد نے نہیں روکے تھے، یہ جملہ جسے بھی کہا جاتا تھا، وہ کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا تھا کیونکہ وہ حقیقتاً اگلی دفعہ کے کھیل میں اس فرد کو شامل نہیں کرتے تھے۔

امجد کی طرف آتی گیند کو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دوسری جانب پھینکا تھا۔ بال سیدھا نیٹ کے اندر گئی تھی۔ گول کیپر نے نہ صرف گول روکا تھا بلکہ تیسرا گول کر کے میچ بھی جیت لیا تھا۔

نادر کتب
Clubb of Quality Content!

امجد کی طرف دوڑ کر آنے والا احمد تھا۔

"چیتے، آج تو کمال ہی کر دیا۔" احمد نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

امجد اسے حیرت سے دیکھے گیا تھا۔ یہ کچھ غیر یقینی سا تھا۔

اس نے ایک طویل وقفے کے بعد کہا تھا۔

"میں نے"

امجد نے مزید حیرانگی سے احمد کو دیکھا تھا۔

"چل بے، تو نے کیا کمال کیا ہے؟ دونوں گولز شفیق نے مارے ہیں، تیسرا میں نے مارا ہے۔"

"اگر میں عمیر لوگوں کو دو گولز کرنے سے روکتا تو کیا تجھے نکالنے کی دھمکی ملتی؟"

مخالف ٹیم کے فرد کا نام لیا گیا تھا۔

"نہیں نا؟

تو نے گول کیوں روکا؟ کیونکہ تجھ پر دباؤ آیا تھا۔ وہ دباؤ میری وجہ سے تھا تو میں اس جیت میں برابر کا شریک ہوں۔"

امجد نے ایک تھپڑ رکھ کر احمد کی گدی پر مارا تھا۔

"تو میں اس جیت میں برابر کا شریک ہے۔"

اس نے نقوش بگاڑتے ہوئے احمد کا جملہ دہرایا تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

کراچی کی رات صبح ہوتی تھی۔ ساری رات کراچی جاگتا تھا۔

لیاری کے چھوٹے سے گھر میں چھوٹی سے محفل سج چکی تھی۔

دو کمروں پر مشتمل گھر جس میں سات افراد رہتے تھے۔

عظمت صاحب اور ذلیخہ بوا ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ذلیخہ بوا کے ساتھ امجد بیٹھا ہوا تھا اور امجد کے سامنے احمد۔ان دونوں کو اکٹھے بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔امجد کے ساتھ اس کی بہن نور بیٹھی ہوئی تھی،جو صبح نو بجے نوکری پر نکلتی تھی اور شام پانچ بجے وہ واپس آتی تھی ۔نور کو سب نوری کہتے تھے۔نوری کے سامنے اس کے بڑے بھائی اجمل کی جگہ تھی۔اجمل بھائی کو شام پانچ بجے دکان پر جانا ہوتا تھا اور رات بارہ بجے وہ واپس آتے تھے۔ثمینہ باورچی خانے سے کھانے کا برتن لیے نکلی تھیں۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

ٹیلی وژن چل رہا تھا۔اس پر خبر چل رہی تھی:

"کراچی کے مشہور پلازہ میں پھولوں کے دکان سے شروع ہونے والی آگ پورے پلازہ میں پھیل گئی۔"

کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی تھی۔برتن لیے کھڑی ثمینہ کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر گرا تھا۔سب نے مڑ کر پہلے ثمینہ کو دیکھا تھا۔وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں تھی۔

کمرے میں ایک دفعہ پھر اینکر کی گلہ پھاڑتی آواز سنائی دی تھی:

"ایم اے جناح روڈ پر قائم گل پلازہ میں خوفناک آتش زدگی۔ شہر کی مشہور و معروف عمارت گل پلازہ، جو ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی خریداری کا مرکز تھا، جہاں شہریوں کو اپنی مرضی کا باآسانی سامان مل جاتا تھا وہ عمارت اب خوفناک شعلوں کی نذر ہو چکی ہے۔"

ایک ہی خبر بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

"ریسکیو کا عملہ آگ بجھانے میں ناکام۔"

اب پلازہ میں بھڑکتے شعلے دکھائے جا رہے تھے۔

عظمت صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"اجمل،اجمل۔۔۔

"تم ٹھیک ہو؟"

ان کی پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ کمرے کے سناٹے میں سب کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

عظمت صاحب نے فون اسپیکر پر کر دیا تھا۔

"ابا، میں دکان کے اندر ہوں۔"

اجمل بھائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"ابا آگ بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے کسی طرح بچا لیں ابا۔"

اجمل بھائی کی آواز میں نمی کی آمیزش تھی۔ وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے

۔

"ابا، میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"ابا میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

"صبح چھت سے اترتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ آج کس کے گھر پر قہر ٹوٹے گا۔ وہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہمارے گھر پر قہر ٹوٹا ہے۔"

گھر میں موجود ہر فرد رو رہا تھا۔ ذلیخہ بوا باقاعدہ بین کرنے لگی تھیں۔ عظمت صاحب چند محلے داروں کے ساتھ گل پلازہ کی طرف نکل گئے تھے۔ گھر کے مرد پر مضبوطی کا سہرا لازمی آتا تھا۔

محلے کے کچھ لوگ ذلیخہ بوا کو تسلیاں دے رہے تھے۔ کچھ ثمینہ کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھے تھے۔ ثمینہ مسلسل خود کو کوس رہی تھیں۔

"کیا ہو جاتا اگر میں اس کو آج روک لیتی؟ وہ تو مجھے کبھی انکار نہیں کرتا تھا۔ ہائے مولا، میرے بچے کو بچا لے۔"

وہ ایک ہی جملہ بار ہا دھرائی جاتی تھیں۔

نوری اپنی جگہ ساکن بیٹھی تھی، اس کی بچپن کی سہیلی، اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں نے آج پورا دن بھائی کا چہرہ نہیں دیکھا۔"

وہ یکدم رونے لگی تھی۔

"کل رات مجھے تنگ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اگر میں مر گیا تو تمھیں بہت یاد آؤں گا۔"

وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی۔

"وہ مرنا نہیں چاہتے تھے، حور۔"

حور نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔

"میں صبح اٹھی تو وہ سو رہے تھے۔ آج واپسی پر دیر سے آئی تو وہ نکل چکے تھے۔ میں نے آج انہیں پورا دن نہیں دیکھا۔"

اسے اس بات کا غم زیادہ تھا کہ وہ آج بھائی کو نہیں دیکھ سکی۔

"اگر وہ جل گئے تو میں کہاں سے اپنا بھائی لاؤں گی؟"

امجد اور احمد اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں جڑواں تھے اور گھر میں سب سے چھوٹے مگر اتنے بھی چھوٹے نہیں تھے کہ حالات کی سنگینی نہ سمجھ سکتے۔

"بھائی مر جائیں گے؟"

یہ سوال کرنے والا امجد تھا۔ وہ امید چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی اس کو یہ یقین دلا دے کہ بھائی بچ جائیں گے۔

"مجھے نہیں پتہ۔"

"اگر بھائی نہ بچے تو ہم کیسے رہیں گے؟"

احمد کو آج امجد کے سوال مشکل لگے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا؟

وہ رات قہر بن کر ٹوٹی تھی۔ محلے دار آہستہ آہستہ سونے چلے گئے تھے۔ پیچھے ایسے دل رہ گئے تھے جن کو تاعمر نیند نہیں آنی تھی۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

عظمت صاحب آگ میں لپٹی عمارت کو دیکھتے رہے تھے۔ جل عمارت رہی تھی اور تکلیف ان کے پورے بدن کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئی تھی۔

"ابا، دکان لے دیں۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم پڑھائی کرو۔ میں خرچ اٹھا رہا ہوں۔"

انہیں یاد تھا کہ اگلے دن شام کو وہ یہ کہہ کر نکلا تھا کہ اسے گل پلازہ میں نوکری مل گئی ہے۔

آج وہ اسی گل پلازہ کو جلتا دیکھ رہے تھے۔

بلند ہوتے شعلوں میں عظمت صاحب نے ایک شخص کو کھڑکی سے چمٹا دیکھا تھا۔ وہ بچنا چاہتا تھا۔ بچاؤ کا سوچتے ہی وہ عمارت کی کھڑکی میں آیا تھا۔ وہ ان کا بیٹا نہیں تھا مگر اس نوجوان لڑکے کو وہ بچانا چاہتے تھے۔ ان کے کانوں میں بازگشت ہوئی تھی۔

"ابو، میں مرنا نہیں چاہتا۔"

دھواں بڑھتا چلا گیا تھا۔ وہ دھڑ جو کھڑکی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا وہیں کھڑکی کے پاس جھلس گیا تھا۔ اسی کھڑکی میں اس کا جھلسا وجود چپک کر رہ گیا تھا۔

عظمت صاحب کی روح تڑپی تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح اپنے ہی قدموں میں گرتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ وہ اپنے بچے کی موت نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے بچے کو بچانا چاہتے تھے۔ وہ اس کے لیے گھنی چھاؤں تھے مگر وہ چھاؤں آج اپنے بچے کو آگ سے نہیں بچا سک رہی تھی۔

گل پلازہ کے سامنے ہر شخص رو رہا تھا۔ ہر فرد غمزدہ تھا۔ ریسکیو کے عملے کی ایک گاڑی پہنچی تھی۔ آگ بجھانے والے چند افراد تھے اور وہ چند افراد بھی آگ بجھانے میں اس حد تک ناکام ہو رہے تھے کہ شعلے مزید بھڑکتے چلے جا رہے تھے۔

ایک گاڑی جو آئی تھی، اس میں موجود پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ جب وہ گاڑی پانی بھر کر واپس آتی تو آگ پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو چکی ہوتی۔ کبھی آگ کا زور ٹوٹنے لگتا تھا تو پانی ختم ہو جاتا تھا۔ جب پانی ہوتا تھا تو آگ کا زور نہیں ٹوٹتا تھا۔

عظمت صاحب کا کلیجہ پھٹنے کو تھا۔ ان کے کانوں میں اپنے بچے کی آواز گونجی تھی۔

"ابا، میں مرنا نہیں چاہتا۔"

وہ عمارت کے شعلے دیکھتے رہے اور ان کی تکلیف بڑھتی چلی گئی۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

رات سے صبح کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ لیاری کے خستہ حال گھر کے افراد آج خاموش تھے۔

نہ ثمینہ کی ڈانٹ سنائی دیتی تھی، نہ امجد اور احمد کے جھگڑوں کی آواز تھی، نہ عظمت صاحب کے شکوے سنائی دیتے تھے اور نہ ذلیخہ بوا کے حلق پھاڑ تبصرے کسی کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

ٹی وی ابھی تک چل رہا تھا۔ گل پلازہ کی آگ ابھی تک بجھ نہیں سکی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد بتایا جا رہا تھا کہ اتنے گھنٹے گزر چکے ہیں مگر انتظامیہ آگ بجھانے میں ناکام۔ حکومت کو کوسا جا رہا تھا۔ آگ بجھانے والے عملے پر تنقید کی جا رہی تھی، مگر نہ یہ تنقید اس گھر کے صحن کو آباد کر سکتی تھی، نہ حکومت کی مالی امداد اس ماں کے لعل کو واپس لا سکتی تھی۔

گل پلازہ واپس تعمیر ہو سکتا تھا مگر گل پلازہ کے دکاندار واپس نہیں آ سکتے تھے۔

ثمینہ بیگم کے سامنے وہ ٹوٹا ہوا برتن ویسے ہی پڑا تھا۔ سالن زمین پر پھیلا ہوا تھا جس کا کچھ حصہ سوکھ چکا تھا۔ ذلیخہ بوا ساری رات رونے کی وجہ سے سوجھی آنکھوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

ان کا گلہ بیٹھ چکا تھا۔ نوری روتے روتے سو گئی تھی۔ امجد اور احمد ایک دوسرے سے لپٹے سو رہے تھے۔

صبح محلے دار پھر اکٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ثمینہ کو کھانا کھلانے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی ذلیخہ بوا کو تسلیاں دے رہا تھا۔

"ثمینہ، دیکھ بچے کھانا کھا لے۔ کھانے سے کیا ناراضگی میری بچی؟"

خالہ ثمینہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے نرمی سے کہہ رہی تھیں اور ثمینہ خالی نظروں سے انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

"میرے بیٹے نے بھی کھانا نہیں کھایا، خالہ۔ میرا بیٹا بھوکا تھا۔"

وہ رونے لگی تھیں۔

"شام کو بھی کھانا نہیں کھا کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا اماں، آج جلدی آجاؤں گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور بوا کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئیں تھیں۔ برتن کی ٹوٹی کرچیاں ان کے پاؤں میں چبھ رہی تھیں مگر انہیں تکلیف محسوس کہاں ہوئی تھی؟

"بوا، میرا بچہ بھوکا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا نا وہ کہہ کر گیا تھا کہ جلدی آجائے گا۔"

بوا ثمینہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر سہلانے لگی تھیں۔ اختلاف اجمل سے بڑھ کر تو نہیں تھا۔ اجمل سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"بوا، میرا پہلا بچہ تھا۔ بوا، میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔"

وہ بڑبڑاتی جارہی تھیں۔

"زندہ نہیں مل رہا تو مجھے میرے بچے کی لاش ہی لادو۔ مجھے میرے بچے کا جھلسا ہوا وجود لادو۔"

ثمینہ کی آہ و بکا سنتے گھر میں موجود ہر فرد رونے لگا تھا۔

"مولا، مجھے میرے بیٹے کا جلا وجود ہی لادو۔"

"مجھے لاش ہی دکھادو۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

رات سے لگی آگ صبح تک دم نہ توڑ سکی تھی۔ ساری رات لوگ آگ بجھنے کی دعا کرتے رہے تھے۔ ہر فرد اپنے ساتھی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

"میری جوان بیٹی تھی۔ اس کی شادی کے لیے سامان لینے آئے تھے۔ بیٹی ہی واپس نہیں آئی۔"

وہ ایک ماں تھی، پلازہ کو جلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

"میں آگ سے نکل آئی، میری بچی اندر رہ گئی۔ میں کیوں نکل آئی؟ میں اپنی بچی کو کیوں چھوڑ آئی؟ میں کیسی ماں ہوں؟"

ماں کو رپورٹر نے گلے لگایا تھا۔ وہ اس ماں کو تسلی دیتی جا رہی تھی اور وہ ماں نفی میں سر ہلاتی رہی تھی۔

کسی دوسرے رپورٹر کے پاس ایک شخص کھڑا تھا۔

"میری بیوی، میرے بچے اندر سامان لینے گئے تھے۔ ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ پہلے فون اٹھا رہے تھے۔ اب فون بھی نہیں اٹھا رہے ہے۔ انتظامیہ کیوں میرے بچوں کو بچا نہیں سکی؟ انتظامیہ اتنی سست کیوں تھی؟"

رپورٹر اس کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ آپ کو مالی مدد ملے گی۔

"میں کیا کروں مال کا؟

میری اولاد نہیں رہی۔ میرا خاندان اجڑ گیا۔ میں اس مال کا کیا کروں گا، جب اس مال کو کھانے والے موجود ہی نہیں ہیں۔ اللہ مدد کر۔ اللہ معجزہ کر دے مولا۔"

پہلے وہ زمین والے کو کوستے تھے پھر وہ آسمان والے کو پکارتے تھے۔ عظمت صاحب ہر کہانی کو سنتے تھے اور ان کا دل بیٹھتا چلا جارہا تھا۔

وہ اپنی محبوب اولاد کو نہیں کھونا چاہتے تھے۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

کراچی کے میئر نے ایک پریس کانفرنس بلائی تھی، جس کانفرنس میں مختلف صحافی موجود تھے۔ میئر نے امدادی رقم کا اعلان کیا تھا۔ایک صحافی نے سوال کیا تھا۔

"سر، پچھلے دس سالوں میں یہ پہلی آگ نہیں ہے۔مجھے اور یہاں پر موجود افراد کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ آگ آخری بھی نہیں ہو گی۔آپ اس پر کیا کہنا چاہیں گے؟"

"حالات پر صحافت نہیں انسانیت دیکھائی جاتی ہے۔"

"سر، کیا کراچی کے بچوں کا یہی نصیب رہ گیا ہے کہ وہ کھلے مین ہول میں گر جائیں، آگ میں جل جائیں، ڈمپر کے نیچے آکر مر جائیں یا دم گھٹ کر مر جائیں؟ کیوں ہر بار کراچی کا کمزور طبقہ ہی مرتا ہے اور کیوں آپ کے بچے بچ جاتے ہیں؟"

میئر نے اس سوال کو نہ صرف نظر انداز کیا تھا بلکہ وہ اس جگہ سے اٹھ کر بھی نکل گئے تھے۔ تمام صحافی خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ یہ بھی پہلی دفعہ تھوڑی ہوا تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

"السلام علیکم!

ناظرین، آپ دیکھ رہے ہیں "پاکستان کے مسائل"۔"

اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ نے بسیرا کیا ہوا تھا۔

"مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ میرے شو کا نام پاکستان کے مسائل نہیں بلکہ کراچی کے مسائل ہونا چاہیے تھا۔ایک اور مال، چند مزید افراد آج آگ کی لپیٹ میں آگئے۔آگ لگے پورا ایک دن گزر گیا اور انتظامیہ ہمیشہ کی طرح آگ بجھانے میں ناکام رہی۔"

اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔

"دو کروڑ سے زائد آبادی رکھنے والے شہر میں کل اٹھائیس فائر اسٹیشن ہیں۔"

اس نے اٹھائیس پر خاصہ زور دیا تھا۔اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ وہ کراچی کے متعلق بولنے پر از حد جذباتی ہو رہا تھا۔

"کراچی سے آدھی آبادی رکھنے والے شہر ڈھاکا میں کل ایک سو بارہ فائر اسٹیشن ہیں۔ تیران میں ڈھاکا سے بھی کم آبادی ہے اور اس میں فائر اسٹیشن کی تعداد چار سو باون ہے۔"

وہ ہر لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

"یہ کوئی ترقی یافتہ ممالک نہیں ہیں مگر پاکستان سے کہیں زیادہ فائر اسٹیشن رکھتے ہیں۔ کراچی میں فائر فائٹرز کی تعداد گیارہ سو ہے جبکہ ڈھاکا میں یہی تعداد ساڑھے چودہ ہزار ہے۔"

"فائر بریگیڈ کی گاڑیاں کراچی میں پچاس ہیں اور ڈھاکا میں وہی گاڑیاں چھ سو کی تعداد میں ہیں۔"

وہ ہر لفظ پر زور دے رہا تھا۔

"یہ پاکستان کا وہ شہر ہے جو سب سے زیادہ محصول دیتا ہے۔ اس پر قوم کے سرمائے کا بوجھ ہے۔ کراچی سب کا ہے مگر کیا کراچی کا بھی کوئی ہے؟"

اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ یہ وہ انداز نہیں تھا جس کے لیے وہ مشہور تھا۔

"یہ وہ روشنیوں کا شہر تھا جس کو دیکھنے کے لیے بیرون ملک سے لوگ آیا کرتے تھے اور اب یہ وہی شہر ہے جو دنیا کے گندے ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔"

اس نے اپنے کان پر لگے آلے سے آواز سنی تھی۔ کنٹرول روم سے اس کو ہدایات دے رہی تھیں اور آج اس نے وہ ہدایت بھی نظر انداز کر دی تھی۔

"جب کانفرنس میں میئر آف کراچی سے سوال کیا گیا کہ وہ اس سارے معاملے پر کیا کہیں گے تو انھوں نے بے لگام انداز میں کہا کہ حالات پر صحافت نہیں کی جاتی۔"

اس نے وقفہ لیا تھا۔

"میرا سوال یہ ہے کہ مان لیا صحافت نہیں کی جاتی انسانیت دکھائی جاتی ہے مگر جناب آپ نے انسانیت کب دکھائی؟"

اس کی آنکھ سے آنسو ٹوٹ کر گرا تھا۔ وہ ضبط کھو چکا تھا۔

"ہم لیاری میں پیدا ہونے والے لوگ ہیں۔ ہماری آنکھ ڈی ایچ اے کے بنگلوں میں رہنے والوں کی طرح نہیں کھلتی۔ ہم آنکھ کھولتے ہی سنتے ہیں کہ گلی کے اس حصے میں اکیلے نہ جانا ڈاکہ پڑ جائے گا مگر کیا ان ڈاکہ ڈالنے والوں کو کوئی پکڑ سکتا ہے؟"

اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ اس کے کان میں پھر ہدایت آئی تھی۔ ٹی آر پی بڑھ رہی تھی اور اس دفعہ اس نے اپنے کان سے آلہ نکال کر سامنے رکھ دیا تھا۔

"شہر کے ہر اس کونے کا لوگوں کو معلوم ہے جہاں ڈاکے پڑتے ہیں مگر کیا ان ڈاکوؤں پر قانون کے ہاتھ پہنچتے ہیں؟"

اس نے بھوئیں اٹھائی تھیں۔اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"بکواس کرتے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔"

اس کا انداز زخمی تھا۔وہ تھوڑا آگے کو جھکا تھا۔

"میرا بھائی گل پلازہ کی آگ میں مرا۔جب اس کی لاش میرے ہاتھوں میں آئی تھی تو وہ ہڈیوں کی بھی صورت میں نہیں تھی۔وہ ہڈیوں کی راکھ تھی۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

پانچ دن مسلسل ماتم رہا تھا۔ثمینہ بیگم بارہا غش کھا کر گر جاتی تھیں۔ذلیخہ بوا بیمار پڑ گئیں تھیں۔ عظمت صاحب پورا دن کہاں کہاں اپنے بچے کی ہڈیاں تلاش کرتے،کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ مختلف اسپتالوں میں جاتے۔وہ اپنا خون ڈی این اے کے طور پر دے چکے تھے۔

پانچویں دن جب وہ گھر واپس آئے تھے تو ان کو کال موصول ہوئی تھی۔

"ہمیں آپ کے بیٹے کی باقی ماندہ حصے ملے ہیں۔آپ لے جانا چاہتے ہیں تو آ جائیں۔"

وہ کسی پانی سے باہر نکلی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھے تھے ۔ وہ دوڑتے ہوئے گئے تھے اور روتے ہوئے واپس آئے تھے۔ وہ ایک پلاسٹک کی تھیلی تھی جس میں ہڈیاں بھی نہیں، ہڈیوں کا چورا تھا ۔ان کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

ان کا فرمانبردار بیٹا،ان کا صابر بچہ کس طریقے سے چورے کی صورت میں انہیں ملا تھا۔

عظمت صاحب جب وہ تھیلی گھر لائے تھے تو گھر میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ وہ آخری چیز تھی جس کی توقع گھر کے افراد کر سکتے تھے۔ ثمینہ بیگم نے اس تھیلی کو سینے سے لگا لیا تھا۔

"میرا صابر بچہ راکھ ہو گیا۔ میرا بچہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے بچے کا دم گھٹ رہا تھا۔"

محلے والے ایک دفعہ پھر اکٹھے ہوئے تھے۔

"ذلیخہ تیرا پوتا جنت میں چڑیوں کی صورت اڑتا ہو گا تو دل نہ ہار۔"

"میرا اجمل بڑا سمجھدار تھا۔اس سمجھداری کو نظر کھا گئی۔ میرے بیٹے کو آگ کھا گئی۔"

اس کے بعد اس گھر میں خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے۔نہ ذلیخہ بوا چھت پر جاتیں، نہ امجد اور احمد لڑتے ، نہ عظمت صاحب شکوے کرتے ۔ سب مشین بن گئے تھے ۔ کام کرتے اور رات کو چھتوں کو دیکھتے دیکھتے سو جاتے۔

Clubb of Quality Content

ذلیخہ بوا اس قدر بیمار ہوئیں کہ موت نے دستک دے دی۔ بوا کی وفات پر سب نے پھر ماتم کیا مگر اس ماتم میں سب بڑی خاموشی سے بیٹھے رہے۔ رویا کوئی نہیں۔ سب کو یہ تسلی تھی کہ اس دفعہ وہ آخری دیدار سے محروم نہیں رہے۔

بوا کی وفات کے بعد سب واپس مشین بن گئے۔

"امجد، کاش اجمل بھائی نہ مرتے۔"

احمد نے نم آنکھوں سے امجد کو دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے حالِ دل کہنے کے عادی تھی۔

"کاش ہم سب اکٹھے مر جاتے، احمد۔"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

"ہمارے گھر میں اب کبھی قہقہے سلام نہیں کریں گے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو افسردگی سے دیکھتے رہے تھے۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

ثمینہ اور امجد اکٹھے سامان لینے گئے تھے۔ اجمل بھائی کو مرے پانچ سال ہو چکے تھے مگر پھر کبھی لیاری کے اُس خستہ حال گھر میں بلند آوازیں نہیں گونجیں۔

امجد اور ثمینہ بائیک پر اکٹھے سامان لینے گئے تھے۔امجد کو بائیک چلاتے ہوئے اچانک لگا تھا کہ اس کی جان فنا ہو رہی ہے اور اگلے ہی لمحے امجد اپنے پورے وجود کے ساتھ چلتی بائیک سے گرا تھا۔ ثمینہ نے خون دیکھا تھا اور اس کو لگا تھا سب فنا ہو گیا۔امجد کے گرتے ہی بائیک بے قابو ہو کر اڑتی ہوئی جا گری تھی۔

پتنگ کی ڈور سے اس کے دوسرے لعل کا گلہ کٹ گیا تھا۔وہ بھول گئی تھیں کہ وہ خود بھی بائیک سے گری ہیں۔ان کا بیٹا اسی جگہ دن توڑ گیا تھا۔ان کے کانوں میں اجمل کی آواز گونجی تھی۔

"میں مرنا نہیں چاہتا۔"

ثمینہ پورے زور سے چیخی تھیں۔وہ ایک بار پھر حکمرانوں کی نااہلی کے باعث اپنی اولاد کھو چکی تھیں۔ان کے بیٹے کی گردن سے ابل ابل کر سرخ دھار بہہ رہی تھی۔وہ سرخ خون کی دھار پر اپنا دوپٹہ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کرتیں۔وہ اپنے امجد کا سر اپنی گود میں رکھے اس کو پکارتی رہی تھیں مگر وہ خاموش رہا تھا۔اس کی سیاہ آنکھیں نہیں کھلیں۔

"امجد،ماں کے لاڈلے۔آنکھ کھول نا بچے۔"

وہ نرمی سے اس کا چہرہ سہلاتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"بچے، میرے چراغ، میرے امجد۔"

وہ اس کے چہرے کو کبھی چومتیں، کبھی اس کے گلے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتیں۔ وہ اس خون کو روکنا چاہتی تھیں، وہ اپنے بیٹے کی گردن کو جوڑ دینا چاہتی تھیں۔

وہ گھر کیسے پہنچیں، وہ نہیں جانتی تھیں۔ ان کے ہاتھ خون سے سرخ تھے۔ وہ ان کے بیٹے کا خون تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے بار بار امجد گھومتا تھا۔ ان کا امجد۔ اجمل کے بعد ان کا امجد بھی چلا گیا۔

نوری حور کے گلے لگ کر روتی رہی تھی۔ وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو کہاں سے واپس لاتی۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا، اس نے اپنے بھائی کا بچوں کی طرح خیال رکھا تھا۔

Clubb of Quality Content

"حور، وہ رات کو مجھ سے پیسے مانگ رہا تھا۔"

"حور، میرا بھائی مر گیا۔ میری اولاد مر گئی، حور۔"

"میرے جگر کا حصہ مر گیا۔ ایک دفعہ پھر میرے دل کا ایک حصہ مر گیا۔"

سترہ سالہ احمد نے جب اپنے ساتھی کی کٹی گردن دیکھی تو اس کو لگا وہ بکھر گیا۔ اس کا امجد مر گیا تھا۔ اس کا ایک اور بھائی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔

اس نے امجد کا کہا جملہ دھرایا تھا۔

کاش ہم اکٹھے مر جاتے۔

اس کی ماں ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکی تھیں، وہ پاگل ہو گئی تھیں۔ ثمینہ نے اپنی دوسری اولاد کو کھویا تو وہ خود بھی کہیں گم ہو گئیں۔ وہ بیٹھی خود سے ہی باتیں کرتی رہتیں۔

کھانے کی ذمہ داری خاموشی سے اس کی بہن نے لے لی۔ عظمت صاحب پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئے، کبھی بیٹھ کر گھنٹوں دیوار کو گھورتے رہتے۔

حکومت نے ایک دفعہ پھر مالی امداد کا اعلان کیا تھا اور مالی امداد پہنچا بھی دی مگر وہ اس مال کا کیا کرتے، جس کو کھانے والے افراد ہی اندر سے مر گئے تھے۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

وہ کیمرے میں دیکھ کر تلخی سے مسکرایا تھا۔

"میں یہ بھی نہیں جانتا کہ جن ہڈیوں پر ہم نے جنازہ پڑھا تھا، جن ہڈیوں پر روز جا کر میں فاتحہ پڑھتا ہوں وہ اجمل بھائی کی ہیں بھی یا نہیں۔ اس کے بعد لیاری کا گھر خاموش ہو گیا۔ میرے گھر کا آنگن حکمرانوں کی نااہلی نے خاموش کر دیا۔"

"پہلے بھائی کی موت آگ سے ہوئی اور دوسرے بھائی کی قاتل پتنگ کی ڈور بنی۔"

اس کی آنکھ سے آنسو گرا تھا۔

"روشنیوں کا شہر کیسے کسی کے بچے نگل سکتا ہے؟ اس ملک کو حکمرانوں نے کھالیا۔"

اور یہاں پر سب نے احمد حبیب اللہ کو روتے دیکھا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو امجد کی وفات کے بعد کسی کے سامنے نہیں رویا تھا۔ آج وہ ساری دنیا کے سامنے اپنا دل چاک کر رہا تھا۔

"اگر حکومت کراچی نہیں چلا سکتی تو چھوڑ دے کراچی کو۔

ہم، کراچی کی عوام اپنے بل بوتے پر اس کو چلا سکتے ہیں اور آپ سے بہتر چلا سکتے ہیں۔

کراچی ہر روز جل جل کر تھک گیا ہے۔ کراچی کی زمین ہر روز نئی قبر کھود کر تھک چکی ہے۔

کراچی کی عوام تھک چکی ہے۔"

اس نے وقفہ لیا تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

وہ اس وقت پہلی دفعہ صحافی بننے کے لیے اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی بولنا شروع کیا تھا کہ اس کا فون تھرتھرایا تھا، اس کا فون ڈائریکٹر نے اٹھایا تھا۔ اس نے ڈائریکٹر کے بدلتے نقوش تو دیکھ لیے تھے مگر وہ وجہ سے آگاہ نہیں تھا۔

بریک لینے پر ڈائریکٹر احمد کے سامنے آکر بیٹھے تھے۔ ڈائریکٹر نے احمد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"تمھاری بہن نہیں مل رہی، تم گھر چلے جاؤ۔"

احمد کو لگا تھا کہ ایک دفعہ پھر اس کی زندگی ختم ہو گئی ہو۔

نوری کی شادی قریب تھی۔ وہ شادی کا سامان لینے خود جایا کرتی تھی کیونکہ ماں ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھیں۔ عظمت صاحب عمر کے آخری حصے میں بھی گھر نہیں بیٹھتے تھے، اگر گھر رہتے تو رونے لگ جاتے اور اب اس کے گھر کا نور بھی غائب ہو گیا تھا۔

وہ پورے راستے خود پر ضبط کرتا رہا تھا۔ اس کی بہن شادی سے چند دن پہلے لاپتہ ہو گئی تھی۔ اگر وہ واپس نہ آئی تو لوگ کہیں گے وہ بھاگ گئی ہے، وہ سب کو اس کی پاکیزگی کی گواہی کیسے دے گا؟

احمد نے لرزتے قدم گھر کے اندر رکھے تھے۔ محلے دار عظمت صاحب کو تسلی دے رہے تھے۔ اس کی ماں کو ہوش ہی نہیں تھا۔احمد کو وہ خوش نصیب لگی تھیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھیں۔امجد اور اجمل کے ساتھ وہ پورا دن باتیں کرتی رہتی تھیں۔

ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ وہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔

نوری کی ساس آئیں تھیں اور رشتہ ختم کر کے چلی گئیں تھیں۔

"اللہ جانے کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔

ہم تو دو دن غائب رہنے والی لڑکی سے شادی نہیں کرتے۔اللہ معاف کرے کیسی بیٹیاں آ گئیں ہیں۔"

Clubb of Quality Content

اس وقت احمد کو احساس ہوا تھا کہ وہ کتنا کمزور ہے۔ اس کے پاس گواہ نہیں تھے۔ اپنی بہن کو پاکیزہ قرار دینے کی گواہیاں نہیں تھیں۔

دو دن بعد بالآخر اس کی بہن کی لاش کچرے کے ڈھیر سے مل گئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ وہ خوش اس بات پر تھا کہ اس کی بہن کی لاش مل گئی ہے۔اب اس کی پاکیزگی کی گواہی اس کو نہیں دینی تھی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ نوری کو مارنے سے پہلے چھ لوگوں نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کو اتنے برے طریقے سے ہراساں کیا گیا تھا کہ اس کے جسم پر نیل، جلائے جانے کے نشان تھے۔ بہت سی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس پر تشدد کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ ہاتھ میں پکڑے احمد کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

"اس روشنیوں کے شہر میں میری اکلوتی بہن نور کا نور بھی جگمگاتا تھا۔ میرے گھر کا نور دو دن گمشدہ رہا۔"

اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"اس شہر میں نہ جانے کتنے گھر کتنے سالوں سے تاریک ہو چکے ہیں۔ یہ شہر روشنیوں کا شہر نہیں رہا، یہ تاریکیوں کا شہر بن گیا ہے۔ ہر گناہ اس شہر کی تاریکی کو بڑھا رہا ہے۔"

احمد آج اپنے حواس میں نہیں تھا۔

مال میں لگی آگ اس کو ماضی میں لے گئی تھی۔ اس کے آشیانے کا جلنا اسی آگ سے شروع ہوا تھا ۔ کاش اجمل بھائی نہ مرتے یا کاش وہ سب اکٹھے مر جاتے۔

Clubb of Quality Content

"وہ روز نہاتی تھی۔

نوری اپنے سیاہ بالوں پر تیل کی مالش کروایا کرتی تھی۔ وہ پاکیزگی کا خیال رکھتی تھی مگر نوری کی پاکیزگی کا خیال کراچی کے شہریوں نے نہیں رکھا۔ وہ دو دن مسلسل اجتماعی درندگی کا شکار رہی۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں تھیں مگر ان چھ لوگوں کو کسی ماں کے لعل نے نہیں تلاش کیا۔ وہ چھ لوگ میری نوری کو درندوں کی طرح استعمال کر کے کچرے کے ڈھیر پر پھینک گئے۔ جب میں نے اس کی لاش اٹھائی تو اس سے بدبو آرہی تھی۔ وہ بدبو کی عادی نہیں تھی مگر اس شہر کی گندگی نے اس کو بدبودار کر دیا۔

میں ہر پولیس اسٹیشن پر ایڑھیاں رگڑتا رہا مگر مجھے کسی نے بھی مجرم نہیں لا کر دیے۔ میں چیختا رہا کہ میری بہن معصوم تھی۔ میری نوری تاریکی نہیں تھی۔ وہ صبح کا نور تھی مگر ہر محافظ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ بیٹے بہن مر گئی ہے انصاف لے کر کیا کرے گا۔ تیری بہن کی کردار کشی اس کو قبر میں تڑپا دے گی۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

بہن کا جنازہ پڑھنے کے بعد احمد گھر آیا تھا اور اس نے عظمت صاحب کو زمین پر اوندھے منہ گرا دیکھا تھا۔ عظمت صاحب کے پاس پوسٹ مارٹم رپورٹ الٹی پڑی ہوئی تھی۔ احمد نے امید لگائی تھی کہ وہ زندہ ہوں گے۔ آگے بڑھ کر اس نے عظمت صاحب کو سیدھا کیا تھا۔

"ابا۔"

وہ بڑبڑایا تھا۔ اس نے کندھا ہلایا تھا۔ وہ کندھا نہیں ہلا تھا۔ وہ ابھی بہن کا جنازہ پڑھ کر آیا تھا اور اب وہ باپ کو غسل دے رہا تھا۔ اس کے باپ کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے کانوں میں امجد کا جملہ گونجا تھا۔

"کاش ہم سب اکٹھے مر جاتے۔"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

احمد عظمت صاحب کا جنازہ پڑھتے ہوئے بس یہی خواہش کرتا رہا تھا کہ اس کو موت آ جائے۔ اس کی زندگی یہ شہر نگل گیا تھا۔ وہ اب سکون کی نیند چاہتا تھا۔

"نہ جانے عظمت کے گھر کو کس کی نظر کھا گئی۔"

احمد کے کانوں سے یہ جملہ ٹکرایا تھا مگر وہ ضبط کرتے گھر آ گیا تھا۔ اگلے دن احمد معمول کے مطابق کام پر جانے لگا تھا۔ احمد کو لگا تھا کہ یہ خبر سن کر ہی اس کو موت آ جائے گی مگر وہ زندہ تھا۔

رات کو دیر سے آتا ماں کو کھانا کھلاتا پھر وہ ماں کی گود میں سر رکھے سو جاتا۔ماں کو صبح اٹھاتا ناشتہ کرواتا اور باہر سے دروازے بند کر کے نکل جاتا۔ماں کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ ثمینہ بیگم کے اگر وہ کپڑے نہ بدلتا تو وہ ہفتوں انہی کپڑوں میں گھومتی رہتیں۔ وہ ماں کے کپڑے بدلواتا۔ماں کو نہلاتا، شروع شروع میں اس کو یہ سب کرتے شرمندگی ہوتی تھی مگر اب وہ عادی ہو گیا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ بچپن سے وہ خیال رکھتی آ رہیں تھیں اب وہ کر رہا تھا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

وہ ہر روز دروازہ بند کر کے جاتا تھا مگر ایک دن وہ معمول سے ہٹ کر تاخیر کا شکار ہو گیا اور اسی تاخیر میں احمد دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔

اس دن ایک دفعہ پھر معمول سے ہٹ کر اس کا فون بجا تھا۔ فون حسب معمول ڈائریکٹر نے اٹھایا تھا۔ وقفے کے دوران وہی ڈائریکٹر احمد کے سامنے آ کر بیٹھا تھا۔

"بیٹے، تمھاری ماں نہیں مل رہیں۔"

اس کے آنگن کا آخری تنکا بھی گم ہو گیا تھا۔

"تم جاؤ، ماں کو ڈھونڈو۔"

Clubb of Quality Content

وہ بائیک پر سوار ہوا تھا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ رش دیکھا تھا۔ کسی احساس کے تحت وہ رک گیا تھا۔

"بھائی، یہاں پر کیا ہوا ہے؟"

"ایک عورت عجیب سے حلیے میں تھی۔ یکدم ہی کھلے ہوئے گٹر میں گر گئی۔"

"کپڑے کس رنگ کے تھے؟"

احمد کی آنکھیں ویران ہونے لگی تھیں۔ کاش کہ وہ اس کی ماں نہ ہوں۔

"بھائی، اتنا تو دھیان نہیں دیا۔"

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

وہ منہ میں پان چبا رہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پان تھوک دیا تھا۔

تقریباً چار گھنٹے بعد اس عورت کی لاش نکالی گئی تھی۔ ان چار گھنٹوں میں احمد مسلسل دعا کرتا رہا تھا کہ وہ ثمینہ بیگم نہ ہوں مگر شاید اس کے آشیانے سے اب زندگی کی امید نہیں آنی تھی۔ اس نے آگے جھانک کر لاش کو دیکھنا چاہا تھا، وہ ثمینہ بیگم تھیں۔ احمد اس بدبودار جسم کو گلے لگا کر خاموشی سے بیٹھا رہا تھا۔ وہ ماں کو نہلاتا تھا کہ کہیں ان کے جسم سے بو نہ آجائے اور اب ثمینہ بیگم

کا وجود ہی گٹر سے نکلا تھا۔ وہ سوچتا گیا تھا۔ کیا ہو جاتا جو وہ آج دروازے بند کر جاتا۔ ہر فوتگی پر اس کے ذہن میں امجد کا جملہ لہراتا تھا۔

"کاش ہم سب اکٹھے مر جاتے۔"

اس کے آشیانے کا آخری تنکا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے آشیانے کی قبریں ساتھ ساتھ بنوائیں تھیں۔

ثمینہ بیگم کی قبر عظمت صاحب کے ساتھ تھی۔ بوا، اجمل بھائی، امجد اور نوری کی قبر ان دونوں کی قبروں کے نیچے تھی۔ نوری کے ساتھ جگہ خالی تھی۔ وہ اس آشیانے کا آخری فرد تھا اور وہ خالی جگہ اس کی تھی۔ قبر پر کھڑے ہو کر اس نے اپنے آنگن کو دیکھا تھا۔ وہ مرنا چاہتا تھا۔ وہ اب گھر والوں کا ساتھ چاہتا تھا۔ وہ امجد سے لڑنے کو ترس گیا تھا۔ وہ بوا کی گالیاں، باپ کی مار، ماں کی ممتا، نوری کی محبت، بھائی کی جھڑکیوں کا محتاج ہو گیا تھا۔ وہ ہر صبح قبرستان اپنے خاندان کے سامنے حال دل بیان کرنے آتا تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

"میری بہن کا غم ابا برداشت نہیں کر سکے اور وہ مر گئے۔ میں نے ایک دن میں دو لوگوں کو دفنایا ۔میری زندگی کے دو چراغ مزید بجھ گئے تھے۔ میرے آنگن میں میری دیوانی ماں باقی تھیں۔ میں نے ماں کے لیے جینے کی کوشش شروع کی کہ وہ گٹر میں گر کر مر گئیں۔"

احمد کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔

"نہ آگ قاتل ہے، نہ ڈور قاتل ہے، نہ اجتماعی زیادتی کرنے والے اصل قاتل ہیں، نہ بغیر ڈھکن کے گٹر، نہ غم۔"

وہ رکا تھا۔

آگے کو جھک کر اس نے انگلی سے کیمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"قاتل آپ اور میں ہیں۔ جو سب جانتے، دیکھتے، سنتے ہوئے بھی اندھے بنے ہوئے ہیں۔ جو یہ سن کر خاموش ہیں کیونکہ ان کے گھر میں یہ آگ نہیں پہنچی۔ میرا پورا آشیانہ تباہ کیا ہے اس حکومت نے اور اس رعایا نے۔ حکومت نااہل تھی اور رعایا خاموش۔ رعایا کی خاموشی جرم ہے۔ حاکم کو جابر ہم نے بنایا ہے۔ میں آپ لوگوں سے اعلان برات چاہتا ہوں۔ میں بغاوت چاہتا

ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روشنیوں کے شہر کے لوگ اٹھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا کراچی پھر سے روشنیوں کا شہر بن جائے۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھا تھا اور پہلے وہ اسٹوڈیو سے باہر نکالا تھا اور پھر وہ اس عمارت سے بھی باہر نکل گیا تھا۔

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

سیاہ کمرے میں آواز گونجی تھی۔

"حبیب اللہ کو مروادو۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

وہ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ محافظ رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ اس کے مطابق محافظ وہ رکھتے تھے جو زندہ رہنا چاہتے ہوں اور وہ تو منتظر تھا کہ کوئی اس کو مارے۔ اس کو ثمینہ بیگم یاد آنے لگی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد وہ لیاری کی گلیاں چھوڑ آیا تھا مگر اب وہ ادھر ہی واپس جارہا تھا۔ اس کی گاڑی نے اچانک جھٹکا کھایا تھا۔ فضا میں شیشے کے ٹوٹنے کی آواز گونجی تھی۔ وہ گولیوں کی زد میں آیا تھا۔ پہلی دفعہ کوئی گولیوں کی زد میں آنے پر مسکرایا تھا۔

"جو بولتا ہے اس کو مار دیا جاتا ہے بچے۔"

جب اس نے بولنا شروع کیا تھا تو کنٹرول روم سے ڈائریکٹر کی تنبیہ کی صورت میں آواز آئی تھی۔

وہ بولا تھا اور وہ مار دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے سینے کا چیرا جانا محسوس کیا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ آنگن کا آخری تنکا اپنی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔

"اللہ تیرا شکر۔ بالآخر ہم سب مر گئے، امجد۔"

~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~•~

"مشہور و معروف صحافی احمد حبیب اللہ ولد عظمت حبیب اللہ کے نماز جنازہ میں لاکھوں افراد نے شرکت کی، وہی وفد اب مئیر ہاؤس کے باہر دھرنا دیے بیٹھا ہے۔"

تمت بالخیر

مزید بہترین ناول/افسانے/آرٹیکل/مختصر کہانیاں اور معیاری شاعری پڑھنے کے لئے

نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کریں۔

شکریہ!

www.novelsclubb.com

ہماری ایپ ڈاؤنلوڈ کریں اور رسائی حاصل کریں بے شمار مزے دار ناولوں تک

Download our app

بہترین کوالٹی کی کتب شائع کروانے کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں۔

03257121842

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری،ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842